محمد حنیف ندوی

علماءِ سوء اور علماءِ آخرت میں فرق

(۳)

امراء و سلاطین کے ہاں آنے جانے اور تعلقات و مراسم قائم رکھنے میں کیا قباحت ہے، اس کی طرف سمنون نے نہایت عمدہ اشارہ کیا ہے:

ما اسمج بالعالم ان یوتی الی مجلسه فلا یوجد فیسئل فیقال هو عند الامیر قال وکنت اسمع انه یقال اذا رایتم العالم یحب الدنیا فاتهموه علی دینکم حتی جربت ذلك اذ ما دخلت قط علی هذا السلطان الا وحاسبت نفسی بعد الخروج فاری علیها الدرك وانتم ترون ما القاه و علماء زماننا شر من علماء بنی اسرائیل یخبرون السلطان بالرخص وبما یوافق هواه ولو اخبروه بالذی علیه وفیه نجاته لا تلفتهم و کره دخولهم علیه وکان ذلك نجاة لهم عند ربهم۔

عالم کے حق میں یہ بات کتنی بُری ہے۔ کہ کوئی اس کی مجلس میں جائے تو کہا جائے کہ وہ تو بادشاہ کے ہاں گئے ہیں۔ میں نے یہ سُن رکھا تھا کہ جب تم کسی ایسے عالم کو پاؤ جو دنیا سے محبت رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ اس کے دین میں کیسا خلل ہے۔ پھر میں نے اس کو خود آزما کر دیکھا۔ جب میں اس بادشاہ کے ہاں گیا۔ اور اس کے بعد اپنے نفس کا محاسبہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس پر اس سے بُرا اثر پڑا ہے۔ ہمارے علماء بنی اسرائیل کے علماء سے بھی بُرے ہیں۔ یہ بادشاہ کو بتاتے ہیں کہ دین میں رخصت کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ اور اگر اس کے برعکس یہ اس کی ذمہ داری پر اس کو مطلع کریں اور اس کو نجات کی راہ دکھائیں۔ تو ان کا آنا جانا ان پر گراں گذرے اور ہرگز ان کو داخل ہونے کی اجازت دے۔ یوں اس طرح خود ان کی نجات کا سامان ہو جاتا ہے۔

حکامِ وقت کے ساتھ راہ و رسم رکھنے اور مال و دولت سے بہرہ مند ہونے کو صحابہؓ کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کو سعد بن ابی وقاصؓ کے اس طرزِ عمل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ان سے ان کے بچوں نے کہا۔ کہ بہتیرے ایسے لوگ جو رُتبہ میں آپ سے کہیں کم ہیں، لیکن محض امراء و سلاطین کے ساتھ مراسم رکھنے کی وجہ سے مالا مال ہیں۔ اور آپ ہیں کہ باوجود آنحضرتؐ کی صحبت و رفاقت سے مشرف ہونے کے بھوک اور افلاس کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ

آپ بھی ان لوگوں سے تعلقات پیدا کریں۔

سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا:

تم مجھے یہ مشورہ دیتے ہو کہ جس مُردار پر لوگ جمع ہیں میں بھی اس میں ان کا شریک اور ساجھی ہو جاؤں۔ یقیناً میں ایسا کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ خوب سمجھ لو کہ یہ جیفہ یا مُردار ہے۔

بال بچوں نے کہا۔ آپ کے استغنا اور امراء سے تنفر کا اگر یہی عالم رہا تو ہم بھوک سے لاغر ہو کر ہلاک ہو جائیں گے۔

سعدؓ نے جو جواب دیا۔ وہ یہ تھا:

یابنیّ لان اموت مومنا مھزولا احب الیّ من ان اموت منافقا سمینا۔	بیٹو! میرا ہزال و ضعف سے مرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ موٹا تازہ ہو کر مروں، لیکن نفاق لئے ہوئے۔

اس میں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ امراء و سلاطین کی دربار داری میں شوائب نفاق سے بچنا محال ہے۔

یہی وہ خطرہ ہے جس کی ابوذر نے نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے سلمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

یاسلمۃ لا تغش ابواب السلاطین فانک لا تصیب شیئا من دنیاھم الا اصابوا من دینک افضل منہ۔	اے سلمہ! بادشاہوں کے دروازوں پر نہ پڑے رہو۔ کیونکہ تم ان سے دُنیا کی اتنی مقدار حاصل نہیں کر پاؤ گے، جتنی مقدار دین کی وہ تم سے وصول کر لیں گے۔

ایک شخص اگر عُمدہ اور مؤثر لب و لہجہ رکھتا ہے تو اس کے لئے اس میں بڑی ہی آزمائش ہے شیطان اس پر یہ کہہ کر قابو پاتا ہے۔ کہ تمہارے کہنے سُننے سے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ظلم و ستم سے باز آ جائے۔ اور شعائرِ دین کو قائم کرنے لگے لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ جہاں یہ دربار میں پہنچا گفتگو میں تملق کا رنگ پیدا ہوا۔ مداہنت کا آغاز ہوا۔ اور مدح و ثنا کے دفتر کھلنے شروع ہوئے۔ یہی وہ ہلاکت ہے جس سے بچ نکلنا ایسوں کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ علماء سلف جیسے حسن، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، ابراہیم ادھم، یوسف بن اسباط، ہمیشہ سلاطین و امراء کے تقرب سے گریزاں رہے۔ اور مکہ و شام کے اُن علماء دنیا پر تنقید کرتے رہے جنہوں نے سلاطین و ملوک کی دربار داری کو شعار ٹھہرایا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کیسے بادشاہ تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ کا عالمِ اسلامی میں شہرہ تھا۔ لیکن بایں ہمہ جب اُنہوں نے حسن کو لکھا کہ مجھے ایسے آدمی بتاؤ جن کو میں مشیر قرار دے سکوں۔ تو حسن نے ان کو جو جواب دیا اس سے سلف کے اصحاب کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

اما اھل الدین فلا یریدونک واما اھل الدنیا فلن تریدھم ولکن علیک بالاشراف	جہاں تک اہلِ دین کا تعلق ہے وہ تو آپ کے دربار میں آنے کے نہیں۔ اور جو اہلِ دنیا ہیں وہ آپ کے مطلب کے نہیں۔ لہٰذا شرفاء

فانهم یصونون شرفهم ان یدنسوہ بالخیانۃ۔ | پر اعتماد کرو۔ ان کو اپنی عزت کا اتنا خیال رہے گا، کہ اسے خیانت سے داغدار نہیں ہونے دیں گے۔

(۵) علمائے حق کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ فتوے دینے میں جلدبازی سے کام نہیں لیتے، بلکہ جب ان سے کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو وہ توقف کرتے ہیں اور حتی الامکان جواب دہی کی ذمہ داریوں سے اپنا دامن بچائے رہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ سرے سے فتوے دینے کو ہی ناجائز تصور کرتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ اس وقت تک کسی معاملہ میں لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے، جب تک انہیں تحقیقی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس بارہ میں نص کتاب اللہ سے یا نصوص سے یا اجماع وقیاس جلی سے شہادت کو تائید بہم پہنچانا ممکن ہے۔ ورنہ صورت مسئلہ میں اگر انہیں احساس ہؤا کہ یہاں کچھ گھپلا اور شک ہے تو یہ لا ادری کہہ کر صاف بچ جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں اجتہادی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ تب بھی اگر مسئلہ میں ظن و تخمین کا پہلو نکلتا ہو تو یہ از راہ حزم واحتیاط اس کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس سے عہدہ برآ ہو۔ جو زیادہ یقین وتثبت کے ساتھ اس کو واضح کر سکے کیونکہ خواہ مخواہ اجتہاد کے خطرہ کو مول لینا ٹھیک نہیں۔ اس "لاادری" کی تائید میں یہ حدیث بھی ہے:

العلم ثلاثۃ کتاب ناطق وسنۃ قائمۃ و لاادری۔ | علم تین چیزوں میں منحصر ہے، کتاب ناطق میں، سنت قائمہ میں اور لاادری میں۔

شعبی کا کہنا ہے:

لاادری نصف العلم ومن سکت حیث لا یدری للہ تعالیٰ فلیس باقل اجرا ممن نطق۔ | "لاادری" کا کہنا بھی نصف علم ہے اور جو نہیں جانتا اور اس پر محض للہ چپ رہتا ہے تو اس کا اجر اس سے کم نہیں جو جانتا اور بولتا ہے

اس کی وجہ ظاہر ہے، اپنی جہالت کا اقرار کرنا آسان نہیں۔ اس سے نفس کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صحابہؓ اور سلف کی روش یہی تھی۔ کہ فتوے دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ یہ عبداللہ بن عمرؓ جن کے علم وفضل سے ہر کوئی واقف ہے جب ان سے فتوے پوچھا جاتا۔ تو یہ کہتے اس کا جواب دینا میرا کام نہیں۔ جاؤ اپنے امیر سے پوچھو جس نے ان ذمہ داریوں کو قبول کر رکھا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ:

ان الذین یفتی الناس فی کل ما یستفتونہ لمجنون۔ | وہ شخص جو ہر اس سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے جو اس سے پوچھا جاتا ہے یقیناً پاگل ہے۔

حضرت علیؓ و حضرت عبداللہؓ کا ایک صاحب پر گذر ہؤا جو وعظ و گفتگو میں مصروف تھے آپ نے فرمایا یہ اصل میں کہہ رہا ہے اعرفونی! لوگو! مجھے بھی تو پہچانو۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں :

تریدون تجعلونا جسوا تعبرون علینا الی جھنم۔ تم ہمیں دراصل پل بنانا چاہتے ہو کہ تمہیں جہنم میں پہنچنا ہے۔

یعنی یہ چاہتے کہ اپنی خواہشاتِ نفس کے لئے ہم سے جواز و اباحت کی سند حاصل کریں۔

ابراہیم التیمی سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو بے اختیار رو دیتے اور کہتے :

الم تجدوا غیری حتی احتجتم الیّ۔ کیا میرے سوا تمہیں اور کوئی جواب دینے والا نہیں ملا۔ جو میری ضرورت محسوس ہوئی۔

حضرت سلمانؓ اور ابو درداءؓ میں آنحضرتؐ نے بھائی چارہ قائم کردیا تھا۔ ان کو معلوم ہوا کہ ابو درداءؓ نے معمولی علاج و معالجہ شروع کردیا ہے۔ اس پر انہوں نے ان کو لکھا :

یا اخی بلغنی انک قعدت طبیباً تداوی المرضی فانظر فان کنت طبیبا فتکلم فان کلامک شفاء وان کنت متطبباً فاللہ اللہ لا تقتل مسلما۔

بھائی مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ تم طبیب کی حیثیت سے زخمیوں کا علاج کرتے ہو۔ اگر فی الواقع تم طبیب ہو گئے ہو۔ تو بے شک دوا اور نسخہ کے بارہ میں گفتگو کرو۔ اللہ تعالیٰ شفا عطا کریگا لیکن اگر تم اناڑی ہو تو اس سے بچو کہیں قتلِ مسلم کا ارتکاب نہ کر بیٹھو۔

ابو درداءؓ نے اس کے بعد علاج سے متعلق مشورہ دینے میں توقف اختیار کیا۔

حضرت انسؓ سے جب کوئی بات پوچھی جاتی۔ تو وہ از راہِ انکساری حضرت حسنؒ کا حوالہ دیتے کہ ان سے پوچھو۔ ابنِ عباسؓ سے جب دریافت کیا جاتا۔ تو وہ سائل کو حارثہ بن زیدؓ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ سے جب کوئی سوال کیا جاتا تو وہ سعید بن المسیبؒ کا پتہ دیتے۔ یعنی ان میں ہر ایک چاہتا کہ کاش اس کی جگہ کوئی دوسرا جواب کی ذمہ داری کو قبول کرلے۔

علوم باطن کی طرف زیادہ التفات رہنا چاہیئے

(۷) علماءِ حق کے لئے ضروری ہے۔ کہ زیادہ تر علمِ باطن کے حصول کے لئے کوشاں ہوں۔ قلب اور احوالِ قلب پر نظر رکھیں۔ اور طریقِ آخرت کو جاننے اور اس پر چل کھڑے ہونے کا اہتمام کریں۔ صدق دلانہ امید رکھیں کہ مجاہدہ و مراقبہ سے ان پر حقائق کا انکشاف ہوگا۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ مراقبہ مشاہدہ پر منتج ہوتا ہے۔ اور دقائقِ علم و حکمت کے سوتے قلب ہی سے پھوٹتے ہیں۔ کتابوں سے اور ظاہری تعلیم سے یہ حاصل ہونے والا نہیں۔ الہام کی اصل کلید اور سرچشمۂ و منبع حکمت یہ ہے کہ انسان ظاہری و باطنی اعمال کو بروئے کار لائے۔ حضورِ قلب اور فکر و خیال کی پاکیزگی کے ساتھ چند ساعتیں اللہ کے سامنے خلوت نشیں ہو۔ اور تمام ماسوا سے قطع تعلق کرکے اس سے وابستہ ہونے کی کوشش کرے۔ اس طریق سے حقیقی علم حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ کتنے ہی طالب علم ایسے ہیں کہ انکی

...ت
...ر یا اس دشت کی بادیہ پیمائی میں گذری ہیں۔ اور سوا الفاظ کی ظاہری سطح کو چھونے کے ان کے علم تے اور کوئی کامرانی حاصل
...یں کی جب کہ انہیں کے مقابلہ میں ایسے لوگوں نے زیادہ حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں۔ اور اللہ تعالٰے نے ایسے لوگوں کے دلوں پر
...ق حکمت کو واضح کیا ہے جنہوں نے اصطلاحی علم کی طرف کم توجہ صرف کی ہے۔ اور عمل کو زیادہ اہم جانا ہے۔ اور قلب کے
...اقبہ و نگرانی کا خاص خیال رکھا ہے۔

عمل سے علم کے بعض خفیہ دروازے بھی کھلتے ہیں۔ اور علم کا ایک ذریعہ مجاہدہ بھی ہے۔ اس کی تائید میں آنحضرتؐ کی یہ
...یث پیش کی جا سکتی ہے:

...ن عمل بما علم ورثه الله علماً مالم یعلم۔ — جو شخص اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ان علوم کا وارث ٹھہراتا ہے جن کو وہ نہیں جانتا۔

اسی طرح اگر یہ حقیقت اپنی جگہ صحیح نہ ہوتی، کہ قلب بھی سرچشمۂ معرفت و نور ہے۔ تو مندرجہ ذیل حدیث میں آنحضرتؐ
...واہر میں دل کو حکم ٹھہرانے کی تلقین نہ فرماتے۔ آپ کا ارشاد ہے:

...ستفت قلبك وان افتوك وافتوك۔ — اپنے دل سے فتوےٰ طلب کر۔ اگرچہ اس کے خلاف فتوےٰ دیں، اس کے خلاف فتوےٰ دیں، اس کے خلاف فتوےٰ دیں۔

اسی مضمون کو آں حضرتؐ نے یوں بیان فرمایا ہے:

...یزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتیٰ احبه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به۔ — بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرّب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس کو چاہنے لگتا ہوں، تو پھر اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ سنتا ہے۔

قلب سرچشمہ علوم و معارف ہے۔ علم اور علماء پر حضرت علیؓ کا آخری خطبہ

چنانچہ وہ لوگ جو اپنے کو عبادت و ذکر کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اور بطریق مراقبۂ فکر میں غواصی کرتے ہیں۔ ان کو ایسے ایسے جواہر و رموز اور معانی دقیقہ پر اطلاع ہوتی ہے۔ کہ ان کو اگر کتب تفسیر میں ڈھونڈئیے تو نہیں ملیں گے۔ یہی حال علم المعاملہ اور علم المکالمہ کا ہے کہ اصحاب ذکر و فکر کی جن اسرار تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے ان تک نہیں پہنچ پاتے۔ غرض دل وہ سمندر بے پایاں ہے اور اس کے علوم و اسرار کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کوئی ان کے احاطہ پر قادر نہیں البتہ بقدر ظرف و مجاہدہ ہر ہر شخص کے لئے بہرہ مندی کی ایک متعین مقدار ضروری ہے۔

حضرت علیؓ نے ایک طویل بیان میں جو ان کی زندگی کا آخری بیان ہے۔ علماء قلب و ذکر کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

القلوب اوعية وخيرها اوعاها للخير والناس — دل بمنزلہ ظروف کے ہیں۔ اور ان میں سے بہتر وہ ہے جس میں خیر کو

ثلاثة عالم ربانی ومتعلم علی سبیل النجاة
وھمج رعاع اتباع لکل ناعق یمیلون مع کل
ریح لم یستضیئوا بنور العلم ولم یلجئوا الی رکن
وثیق العلم خیر من المال العلم یحرسك و
انت تحرس المال والعلم یزکوا علی الانفاق
والمال ینقصه الانفاق والعلم دین یدان
به تکتسب به الطاعة فی حیاته وجمیل
الاحدوثة بعد وفاته العلم حاکم والمال
محکوم علیه ومنفعة المال تزول بزواله مات
خزان الاموال وھم احیاء والعلماء احیاء
باقون ما بقی الدھر ثم تنفس الصعداء
وقال ھاه ان ھھنا علما جما لو وجدت له
حملة بل اجد طالبا غیر مامون یستعمل
بنعم اللہ علی اولیائه ویستظھر بحجته علی
خلقه او منقادا لاھل الحق لکن ینزرع الشك
فی قلبه باول عارض شبھة لا بصیرة له لا
ذا ولا ذاك او منھوما باللذات سلس القیاد
فی طلب الشھوات او مغری بجمع الاموال
والادخار منقاد الھوا اقرب شبھا بھم الانعام
السائمة اللھم ھکذا یموت العلم اذا مات
حاملوه ثم لا تخلوا الارض من قائم للہ
بحجة اما ظاھر مکشوف واما خائف مقھور
لکیلا تبطل حجج اللہ تعالیٰ وبیناته وکم و
این اولئك ھم الاقلون عددا الاعظمون
قدرا اعیانھم مفقودة وامثالھم فی القلوب

بحفاظت رکھا جاتا ہے۔ لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک عالم ربانی ہے، دوسرا وہ طالب علم ہے جو نجات کی خاطر علم کا جویاں ہے اور تیسرے درجے میں ان عوام کا نمبر آتا ہے جو ہر چیخ و پکار کے ساتھ ہو لیتے ہیں، اور ہوا کے ہر ہر جھونکے کے ساتھ جھک جاتے ہیں۔ علم مال سے کہیں بہتر ہے، کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور مال کی نگرانی تمہیں کرنی پڑتی ہے علم خرچ کرنے پر بھی بڑھتا ہے، جبکہ مال خرچ کرنے سے اور گھٹتا اور سمٹتا ہے۔ علم دین ہے جس کو مانا جاتا ہے، زندگی میں اطاعت کا ذریعہ ہے اور زندگی کا بہترین ترکہ ہے، علم حاکم و سلطان ہے اور مال محکوم علیہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، پھر مال کی منفعت عارضی ہے۔ مال و دولت کے محافظ انتقال کر گئے۔ جبکہ علماء جب تک کہ زمانہ باقی ہے زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے .... اتنا کہہ کر سرد آہ کھینچی اور فرمایا، یہاں علم کی فراوانیاں موجود ہیں، کاش کوئی ان کا کوئی حامل ملتا۔ میں جن کو پاتا ہوں یا تو وہ ایسے طالب علم ہیں جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ دین کو حصولِ دنیا کا ذریعہ ٹھہراتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اور اس کے اولیاء پر ظلم کی بحث سے خواہ مخواہ زیادتی کرتے ہیں یا ایسے لوگ ہیں جو اہلِ حق کے منقاد تو ہیں لیکن ان کو بصیرت حاصل نہیں۔ چنانچہ شک کے پہلے ہی ریلے سے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات کے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا ایسے حضرات ملتے ہیں جو لذات پر فدا ہیں اور شہوات کی طلب میں لگے ہوئے ہیں یا مال و دولت کے جمع کرنے اور سمیٹنے کا ان میں عشق ہے۔ یہ ایسے بندۂ ہوا ہیں کہ ان کو جانور کہنا زیادہ صحیح ہے۔ علم پر اسی طرح موت طاری ہوتی ہے کہ اس کے حاملین مر جائیں اور زندہ نہ رہیں لیکن اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی زمین ان لوگوں سے خالی نہیں رہتی۔ جو اس کی حجت کو قائم کرتے ہیں۔

موجودة يحفظ الله بهم حججه حتى يودعوها من وراءهم ويزرعوها في قلوب اشباههم هجم بهم العلم على حقيقة الامر فباشروا روح اليقين فاستلانوا ما استوعر منه المترفون وانسوا بما استوحش منه الغافلون صحبوا الدنيا بابدان ارواحها معلقة بالمحل الاعلى اولئك اولياء الله عزو جل من خلقه وامنائه وعماله في ارضه والدعاة الى دينه ثم بكى وقال واه اشوقاه الى رويتهم۔

ان کی دو صورتیں ہیں، یا تو وہ ظاہر اور مکشوف ہوتے ہیں۔ اور یا خائف و مقہور تاکہ اللہ تعالیٰ کی حجت و دلیل باطل نہ ٹھہرے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں کس قدر ہے؟ اور یہ کہاں رہتے ہیں؟ یہ تعداد میں کم ہیں لیکن رتبہ میں زیادہ ہیں۔ ان کے اجسام گو شخصیتیں نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ان کا پرتو دلوں میں موجود ہے انہیں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے حجج و دلائل کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے "تاآنکہ یہ حجج و دلائل کو اپنے اخلاف کے سپرد کر جائیں۔ اور اپنی طرح کے دلوں میں ان معارف کی تخم ریزی کر جائیں۔ علم ان کو حقیقتِ امر سے اطلاع دیتا ہے جس سے کہ یہ یقین کی رُوح کا براہِ راست سامنا کرتے ہیں۔ اس سے ان کی طبیعتیں نرم ہوتی ہیں۔ جبکہ مترفین اسی سے سخت ہوتے تھے۔ اور اس سے ان کو ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہوتا ہے جبکہ غافل اس سے توحش محسوس کرتے تھے۔ یہ اپنے اجسام و ابدان سے تو بلاشبہ دُنیا میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کی روحیں ملاءِ اعلیٰ سے وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اولیاء اللہ ہیں جو اس کے اُمنا اور عمّال ہیں۔ اور اس کے دین کی طرف لوگوں کو بُلانے والے ہیں، اتنا کہہ کر رو پڑے اور کہا ہائے ان لوگوں سے ملاقات کا کس قدر شوق ہے؟

حصول یقین اور تقویتِ یقین علماءِ عقلی کا ایک خاصہ

(۸) علماءِ حق کا ایک خاصہ حصولِ یقین اور تقویتِ یقین ہے۔ یعنی جہاں تک ان کی تگ و دو کا تعلق ہے پہلے یہ اوائلِ یقین سے بہرہ مند ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ اس کے بعد یقین کے آخری مدارج کا انکشاف ان پر خود بخود بطریقِ قلب اور مجاہدہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق آنحضرت نے فرمایا ہے:

الیقین ایمان کلہ	یقین پورا پورا ایمان ہے
تعلموا الیقین	یقین کی تعلیم حاصل کرو

مقصد یہ ہے کہ ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھو جو اہلِ یقین ہیں۔ انہی کی باتیں سنو اور انہی کی اقتداء پر مواظبت اختیار کرو۔ جن کے دلوں کو شک و ریب کی خلش نے مجروح نہیں کیا۔ تاکہ یہی کیفیتیں تمہارے اندر پیدا ہوں۔ یقین کی قدر و قیمت کیا ہے، یہ جاننے کے لئے اس قدر معلوم کر لینا کافی ہے کہ اس کی تھوڑی مقدار بھی عملِ کثیر کے مقابلہ میں بہت ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ سے جب کہا گیا ہے کہ ایک آدمی ایسا ہے جو اعتقاد و یقین کے اعتبار کی نعمت سے تو مالامال ہے لیکن کثرتِ معاصی نے اُسے گھیر رکھا ہے۔ تو آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا:

ما من آدمی الا وله ذنوب ولكن من كان غريزته العقل وسجيته اليقين لم تضره الذنوب لانه كلما اذنب تاب واستغفر وندم فتكفر ذنوبه ويبقى له فضل يدخل به الجنة۔

ہر آدمی کچھ نہ کچھ گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے لیکن جس کی طبیعت سمجھ سوچ کی حامل ہے اور جس کی عادت میں یقین واذعان کے دواعی کو مانتا ہے۔ گناہ اس کو مضرت نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ وہ جب بھی گناہ کا ارتکاب کریگا اس میں توبہ کا جذبہ اُبھریگا اور یہ استغفار و ندامت کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ مزید برآں اس کے لئے ایسے فضل کا اہتمام ہوگا جو اس کو جنّت میں داخل کر دیگا۔

اسی حدیث کو آں حضرتؐ نے ایک دوسری جگہ یوں ادا فرمایا ہے:

ان من اقل ما اوتیتم الیقین وعزیمة الصبر ومن اعطی حظه منهما لم یبال مافاته من قیام اللیل وصیام النهار۔

تمہیں کم سے کم جو عطا کیا گیا ہے وہ دو چیزیں ہیں یقین اور عزیمت صبر۔ اب اگر کسی کو ان دونوں میں سے کچھ بہرہ ملتا ہے تو یہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ قیام لیل اور صوم نہار سے کیا کیا چھوٹ گیا۔

یحیٰی بن معاذ کا کہنا ہے:

ان للتوحید نورا وللشرک نارا وان نور التوحید احرق للسیئات الموحدین من نار الشرک لحسنات المشرکین۔

توحید میں ایک قسم کا نور ہے اور شرک میں ایک طرح کی آگ ہے اور توحید کا یہ نور جس قدر موحدین کی برائیوں کو جلا کر راکھ کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اس درجہ شرک کی آگ مشرکین کے حسنات کو جلا ڈالنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

یقین کی حقیقت اور اس کے مقامات اربعہ۔ نور سے ان کی مراد یہی یقین ہے۔ قرآن نے بھی اس حقیقت کی طرف متعدد مقامات میں اشارہ کیا ہے کہ یقین ہی وہ رابطہ اور واسطہ ہے جس کی وجہ سے تمام نیکیاں اور سعادتیں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں۔

اس مرحلہ پر پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ خود یقین کیا ہے؟ اور اس کے قوی و ضعیف ہونے کے کیا معنی ہیں تو اس کا سمجھنا اور اس کے بعد اس کی طلب و جستجو میں سرگرم ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک اس کا نقشہ ذہن میں واضح نہیں ہو پائے گا اس وقت تک طلب و آرزو کے داعیے محرک نہیں ہونگے۔ اور اس کے لئے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ یقین کا اطلاق چار مختلف معانی پر ہوتا ہے یا یہ کہ چار مقام ہیں:

اوّل۔ اگر خبر و گمان ایسے امر پر مشتمل ہو۔ کہ اس میں تصدیق و تکذیب کے امکانات برابر موجود ہوں تو اسے شک سے تعبیر کرینگے۔ مثلاً اگر آپ سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ فلاں شخص جو مجہول الحال ہے جنّت میں جائے گا یا نہیں۔ تو آپ قطعیت کے ساتھ کوئی جواب نہیں دے پائیں گے۔ کیونکہ اس کا جنتی ہونا اتنا ہی ہے اور ممکن ہے جتنا کہ اس کا دوزخی ہو

ثانی۔ فرض کیجئے آپ کے سامنے ایک ایسا آدمی ہے جس کے صلاح و تقوے کے بارہ میں آپ کو علم ہے اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس کا خاتمہ اسی کیفیت پر ہو جائے تو یہ عقبیٰ کی سزا سے بچ جائے گا۔ لیکن کسی خفیہ لغزش اور معصیت کے امکان کے پیش نظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مستوجب عقوبت ہو۔ اس حالت میں میلانِ نفس گو اس کی نجات کی طرف ہے۔ لیکن عقوبت و سزا کے امکان کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس صورت میں فرق صرف یہ ہے کہ گمانِ نجات کو ترجیح حاصل ہے اور گمانِ عقوبت محض درجۂ امکان پر ہے۔

ثالث۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی تصدیق کی طرف اس طرح مائل ہوتا ہے کہ اس کے مخالف پہلو کو ذہن قبول ہی نہیں کرتا۔ یہ معرفت اگرچہ محقق دلائل کی بنا پر اسے حاصل نہیں ہوتی۔ تاہم کچھ دوسرے اسباب و ذرائع سے اس طرح ذہن و قلب پر غلبہ پا لیتی ہے کہ اس میں تشکیک و تذبذب کے لئے گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کیفیت کو اعتقاد و مقارب للیقین کہتے ہیں۔ اس کی عمدہ مثال عوام کے معتقدات میں ملے گی کہ محض سماع و تقلید سے ان کو اپنے متبوع کا حق پر ہونا اسطرح معلوم ہے کہ اس میں خطر کا کوئی امکان ہی نہیں، حتیٰ کہ اگر آپ ان کو ان کی اعتقادی لغزشوں پر متنبہ بھی کریں تو یہ ماننے والے نہیں۔

رابع۔ معرفتِ حقیقی یا یقینِ کامل کا پورا پورا اطلاق اس حقیقت پر ہوتا ہے کہ بطریقِ بُرہان و دلائل یہ ثابت ہو جائے کہ جس چیز پر اعتقاد ہو جائے وہی صحیح ہے۔ بخلاف ازیں اس کے مخالف پہلو کے لئے کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔

صوفیاء اور جمہور علماء کا تصوّرِ یقین۔ لیکن یقین کا یہ درجہ اس سے زیادہ مفہوم نہیں رکھتا کہ یہاں شک معدوم ہے یا یہ کہ جس چیز پر اعتقاد ہے اس میں شبہ و ظن اور تخمین و گمان کی گنجائش نہیں یہ متکلمین کی تعبیر ہے فقہاء و صوفیاء اور جمہور علماء کا تصوّر دوسرا ہے۔ ان کے یقین کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ معتقدات میں شک کے دروازے بند ہوں اور احتمال و تخمین کے امکانات نہ پائے جائیں۔ بلکہ اس سے زیادہ ان کے ہاں اس حقیقت کا یقین ہے کہ اس میں شک و ریب کی دخل اندازیوں کو درخورِ اعتناء ہی نہ سمجھا جائے۔ اور نظر صرف غلبہ و استیلا پر ہو۔ یعنی دیکھا یہ جائے کہ آیا یقین دل پر مستولی ہے یا نہیں اور عقل و فہم پر اس درجہ یہ طاری ہے کہ نہیں کہ یہی حاکم اور متصرف ہو اور ساری عملی زندگی اسی کے تابع فرمان اور ماتحت ہو۔

یقین میں قوت و ضعف کے مدارج ہیں۔ ایسا یقین کہ گویا یقین نہیں ہے

اس فرق کو یوں سمجھئے کہ دلائل کے نقطۂ نظر سے موت کی قطعیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ حتمی و یقینی چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا ایمان موت پر نہیں۔ یا یہ کہ وہ موت کے معاملے میں ضعیف الیقین ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موت اس کے دل پر مستولی نہیں۔ اور اس یقین کو اس کے دل میں یہ حیثیت حاصل نہیں کہ یہ متصرف اور مستحکم ہو سکے اور اس کی خواہشات کو عقبیٰ کے سانچے میں ڈھال سکے۔ اس فرق کو زیادہ صفائی اور وضاحت سے سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ موت پر یقین رکھنے کے باوجود اور اس واقعہ سے ہر روز دوچار ہونے کے باوصف دونوں طرح کے لوگ برابر

پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اس سے متاثر ہیں اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسے غفلت شعار بھی ہیں کہ اس پر یقین رکھنے کے باوجود اس کی طرف مطلق نہیں رکھتے اور اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کرتے۔ ان میں اس درجہ غفلت وسہو ہے اور اتنی بے اعتنائی ہے کہ گویا یہ موت کے قائل ہی نہیں۔ یقین میں یہی درجہ کا وہ تفاوت ہے، جس کی بنا پر اس میں قوّت وضعف کا فرق قائم کیا جاتا ہے اور اسی حقیقت کی طرف ایک صاحب نے ان حکیمانہ الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

مارایت یقیناً لا شك فیه اشبه بشك لا یقین فیه من الموت۔

میں نے موت کے لئے ایسا کوئی یقین نہیں پایا کہ جس میں شک نہ ہونے کے باوجود اسے شک سے تشابہ اور مماثلت ہو کہ گویا اسمیں یقین ہے ہی نہیں

یقین خفی اور یقین جلی۔ جب یقین کے اس رتبہ کی توضیح ہو چکی۔ تو اب یہ جاننا چاہیئے کہ جس طرح اس میں قوّت وضعف کے مدارج ہیں۔ اسی طرح اس میں خفا و جلا کا ایک فرق ہے۔ ایک ایمان جلی ہوتا ہے اور ایک خفی۔ مثلاً جہاں تک تواتر کا تعلق ہے تم اس کو تسلیم کرتے ہو کہ مکّہ مکرمہ ایک مقام ہے۔ مدینہ و فدک ایک متعیّن جگہ کا نام ہے۔ اور موسٰی و یوشع اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے لیکن، ان دونوں میں تصدیق وتسلیم جس قدر جلی اور واضح اوّل الذکر میں ہے، اس درجہ ثانی الذکر میں نہیں۔ کیونکہ وہ اسباب و دواعی جن سے کہ یقین میں یہ وضوح پیدا ہوا ہے، وہ مکہ و فدک کے بارہ میں نسبتاً زیادہ قوی ہیں۔

افکارِ غزالی
مصنفہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی
قیمت پانچ روپے

اسلام اور رواداری
مصنفہ مولانا رئیس احمد صاحب جعفری ندوی
قیمت چھ روپے

طب العرب
مترجمہ حکیم سید علی احمد صاحب نیّر واسطی
قیمت چھ روپے

اسلام اور موسیقی
مصنفہ مولانا محمد جعفر شاہ صاحب ندوی
قیمت تین روپے ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور